قرآن کی نگاہ میں

مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ اجتماعی طرز زندگی

سید ثاقب اکبر[1]

خلاصہ:

اسلام کے عمومی نظام فکر و اخلاق کو کسی ایک گروہ، مذہب یا دین کے ماننے والوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بنیادی عقائد، اسلام کی کائنات شناسی، اسلام کا تصور انسانی اور اسلام کا آفاقی تصور قانون سب عمومیت اور جامعیت رکھتے ہیں۔ یہی حال اسلام کے نظام اخلاق کا بھی ہے۔ انسانی مساوات کا اسلامی نظریہ، آزادی عقیدہ و مذہب کے بارے میں اسلام کی تعلیم اور انسانی شرف و کرامت کا تصور مسلمان اور غیر مسلم سب پر محیط ہے۔ اسی طرح سچ بولنے اور جھوٹ سے اجتناب کا حکم سب کے لیے ہے۔ وعدے کا پورا کرنا بہر حال ضروری ہے، چاہے مسلمان سے وعدہ کیا جائے یا غیر مسلم سے۔ معاہدوں کی پاسداری اسی ضمن میں آجاتی ہے۔ کسی پر بھی اسلام ظلم کی اجازت نہیں دیتا اور اس میں مسلم و غیر مسلم میں تمیز روا نہیں رکھتا۔ اسی طرح شہادت اور گواہی کا مسئلہ بھی عمومیت رکھتا ہے۔ گواہی کسی مسلمان کے خلاف پڑتی ہو اور کسی غیر مسلم کے حق میں سچی شہادت اسے فائدہ پہنچاتی ہو تو اسلام میں سچی گواہی دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ انسانوں کے باہمی حقوق ہوں، والدین سے حسن سلوک یا ہمسائے کے ساتھ اعلیٰ طرز عمل اسلام اس سلسلے میں کسی دین و مذہب کے فرق کا روادار نہیں۔ قرآن حکیم کے ایسے احکام کو عمومیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کو حق نہیں پہنچتا کہ غیر مسلموں کے بارے میں ان احکام میں کوئی تبعیض یا دوئی کا مظاہرہ کریں۔

بنیادی کلمات: قرآن، مسلم، غیر مسلم، زندگی، انبیاء، سلوک، معاشرے، ریاست

[1]۔ چیئرمین البصیرہ، ڈپٹی جنرل سیکرٹری ملی یکجہتی کونسل

پس منظر اور تشخیص موضوع

مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کا موضوع اپنے مقام پر بہت وسیع ہے۔ مسلمان اکثریتی معاشرے میں غیر مسلموں سے سلوک، غیر مسلم اکثریتی معاشرے میں مسلمانوں کا غیر مسلموں سے سلوک اور غیر معمولی حالات میں خصوصاً جنگوں میں مسلمانوں کا غیر مسلموں سے سلوک جیسے تمام پہلو کلی طور پر اس موضوع کے تحت آ جاتے ہیں۔ تاہم ہمیں پیش نظر صفحات میں یہ دیکھنا ہے کہ بحیثیت مسلمان اپنے علاقوں یا ملکوں میں رہنے والے غیر مسلموں سے برتاؤ کے لیے قرآن حکیم ہمیں کیا راہنمائی کرتا ہے۔ مسلمان اکثریتی معاشرے میں غیر مسلموں سے سلوک کا موضوع ایک طرف ریاست اور حکومت سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری طرف عام مسلمانوں سے۔ ریاستی حوالے سے دیکھا جائے تو وراثت، قانون شہادت، سود، قصاص، دیت، شراب نوشی، سور کا کھانا وغیرہ، دینی مذہبی آزادی، مذہبی تبلیغ، ارتداد اور توہین مقدسات کے موضوعات عصر حاضر میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں حکومتی تشکیل میں غیر مسلموں کا حصہ اور حکومتی و ریاستی مناصب پر ان کی تقرری، نصاب تعلیم میں غیر مسلموں کی تعلیمات کا لحاظ اور ملازمتوں وغیرہ میں ان کا حصہ یا انتخاب جیسے موضوعات بہت بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمیں اس موقع پر یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آج کی دنیا پہلے کی نسبت بہت سے پہلوؤں سے مختلف ہو چکی ہے۔ منظم ریاستیں معرض وجود میں آ چکی ہیں۔ آئینی حکومتوں کا ماضی میں تصور نہیں تھا لیکن آج خود مسلمانوں کے بیشتر ممالک میں آئینی حکومتیں قائم ہو چکی ہیں، جن میں غیر مسلموں کے بارے میں ذمی اور غیر ذمی کی تقسیم عملی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ شاید اس اصطلاح سے استفادہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان معاشروں میں اب تمام غیر مسلم ایک لحاظ سے ذمی ہیں کیونکہ مسلم ریاست نے آئینی تقاضوں کے مطابق ان کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور انھوں نے بھی ریاست، آئین اور قانون سے وفاداری کا عہد کر لیا ہے۔ اس طرح سے ذمی کی ماضی کی تعریف بہت حد تک ایسی ریاستوں میں غیر مسلموں پر صادق آتی ہے۔ بالعموم بیشتر اجتماعی قوانین ریاست کے تمام شہریوں کے لیے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ آئین اور قانون تمام شہریوں کے لیے حقوق معین کرتا ہے۔ آئین شکن یا قانون شکن مسلمان ہو یا غیر مسلم ریاست اور اس کے قانون کی نظر میں مساوی ہوتا ہے۔ اسی طرح سے دشمن کا ایجنٹ

مسلمان ہو یا غیر مسلم اسے بہر حال محارب یا غدار ہی سمجھا جاتا ہے۔ ماضی کی اصطلاح میں محارب یا باغی ایسے ہی شخص کو کہا جا سکتا ہے۔ ان تمام موضوعات پر سوچا اور لکھا بھی جاتا ہے اور گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ تاہم وہ پہلو جو قانون ساز اداروں، حکومتی ذمہ داروں اور ریاستی مسؤلین کے کرنے کا ہے ہم یہاں ان سے صرف نظر کرکے فقط موضوع کے اس حصے پر قرآن کے حوالے سے نظر ڈالیں گے کہ عام مسلمانوں کو اپنے معاشرے میں رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے یعنی قرآن کی نگاہ میں مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ اجتماعی طرز زندگی کیا ہونا چاہیے۔

قرآن کی جامعیت اور اس کا موضوعی مطالعہ

قرآن حکیم جو کتاب ہدایت ہے اس کی تشکیل ایک غیر معمولی انداز سے ہوئی ہے اور وہ تدریجی طور پر ایک تشکیل پانے والے معاشرے کے لیے مختلف صورت حال میں اترتا رہا ہے، اس لیے اسے کسی خاص موضوع کی کتاب نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس پر کتاب کا وہ تصور صادق آتا ہے جو کسی غیر آسمانی کتاب کے لیے ہمارے ہاں رائج ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں ہے کہ قرآن انسان سازی اور معاشرہ سازی کے جامع قوانین اور ہدایات کا حامل ہے۔ قرآن کی تعلیمات کا ایک خاص ہدف ہے وہ انسان اور معاشرے کو اپنے جامع تصور کے مطابق کمال کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم اپنی ضرورت کے مطابق موضوعی لحاظ سے اس کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور پیش نظر موضوع کے اعتبار سے اس سے ہدایات اخذ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ شاید قرآن کے طالب علموں کی مجبوری ہے یا موضوعی مطالعے کا تقاضا ہے۔ اسی تقاضے کے پیش نظر ہم اپنے موضوع پر قرآن حکیم میں موجود مختلف آیات پر نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام کا عمومی نظام فکر و اخلاق اور غیر مسلم

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلام کے عمومی نظام فکر و اخلاق کو کسی ایک گروہ، مذہب یا دین کے ماننے والوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بنیادی عقائد، اسلام کی کائنات شناسی، اسلام کا تصور انسانی اور اسلام کا آفاقی تصور قانون سب عمومیت اور جامعیت رکھتے ہیں۔ یہی حال اسلام کے نظام اخلاق کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی مساوات کا اسلامی نظریہ، آزادی عقیدہ و مذہب کے بارے میں اسلام کی تعلیم اور انسانی شرف و کرامت کا تصور مسلمان اور غیر مسلم سب پر

محیط ہے۔اسی طرح سچ بولنے اور جھوٹ سے اجتناب کا حکم سب کے لیے ہے۔اسی طرح سے وعدے کا پورا کرنا بہر حال ضروری ہے، چاہے مسلمان سے وعدہ کیا جائے یا غیر مسلم سے۔ معاہدوں کی پاسداری اسی ضمن میں آجاتی ہے۔ کسی پر بھی اسلام ظلم کی اجازت نہیں دیتا اور اس میں مسلم و غیر مسلم میں تمیز روا نہیں رکھتا۔اسی طرح شہادت اور گواہی کا مسئلہ بھی عمومیت رکھتا ہے۔ گواہی کسی مسلمان کے خلاف پڑتی ہو اور کسی غیر مسلم کے حق میں سچی شہادت اسے فائدہ پہنچاتی ہو تو اسلام میں سچی گواہی دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کے احکام کو عمومیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کو حق نہیں پہنچتا کہ غیر مسلموں کے بارے میں ان احکام میں کوئی تبعیض یا دوئی کا مظاہرہ کریں۔اس سلسلے میں پیش نظر سطور میں ہم قرآن حکیم سے مثال کے طور پر چند پہلوؤں کی نشاندہی کریں گے۔

انسانی مساوات

معاشرے کے تمام طبقوں سے تعلق کی بنیاد انسانی مساوات کے نظریے کو ہونا چاہیے۔ یہی نظریہ مسلم اور غیر مسلم کے مابین تعلقات کی تشکیل میں بھی مددگار ہے۔قرآن حکیم کے نظریے کے مطابق تمام انسان ایک مرد و زن سے پیدا کیے گئے ہیں اور پھر ان کے خاندان اور قبیلے بنتے چلے گئے۔انسان ہونے کے حوالے سے سب برابر ہیں۔قرآن حکیم کی کئی ایک آیات اس سلسلے میں ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔ارشاد خداوندی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً[1]

اے انسانو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمھیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور پھر اس میں سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتوں کو پھیلایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[1]

[1] ۔ ۴/النساء:۱

اے انسانو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، زیادہ عزت والا تو اللہ کے نزدیک وہی ہے جو پرہیزگاری میں زیادہ ہو۔

آزادی عقیدہ و مذہب

سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنے معاشرے میں غیر مسلموں کے لیے جسے قدر اور اصول کا لحاظ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ انھیں اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی ہے۔ مسلمانوں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی غیر مسلم کو مجبور کریں کہ وہ اپنا عقیدہ، دین یا مذہب تبدیل کرے۔ اصولی طور پر عقیدہ و ایمان کا تعلق دل سے ہے اور دل کو زبردستی کسی نظریے کا قائل یا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ اجبار و اکراہ سے کسی چیز کے اقرار یا تصدیق کو قبول بھی نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی متعدد آیات ہماری راہنمائی کرتی ہیں:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[2]

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ[3]

اگر تمھارا رب چاہتا تو زمین پر بسنے والے سب کے سب ہی ایمان لے آتے، کیا تم انسانوں پر زبردستی کروگے تاکہ وہ مومن بن جائیں۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ[4]

کہو کہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہے بس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔

---

[1] ۔۴۹/الحجرات:۱۳

[2] ۔ ۲/البقرہ:۲۵۶

[3] ۔۱۰/یونس:۹۹

[4] ۔۱۸/الکھف:۲۹

''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کی تفسیر میں علامہ طبرسی نے اگرچہ متعدد اقوال نقل کیے ہیں لیکن اپنے دلائل اسی مفہوم پر قائم کیے ہیں جو ہم نے یہاں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ان المراد لیس فی الدین اکراہ من اللہ ولکن العبد مخیر فیه لان ما هودین فی الحقیقة هو من افعال القلوب اذا فعل لوجه وجوبه فأما ما یکره علیه من اظهار الشهادتین فلیس بدین حقیقة کما أن من أکره علی کلمة الکفر لم یکن کافراً[1]

اس سے مراد یہ ہے کہ دین کے بارے میں اللہ کی طرف سے اکراہ اور زبردستی نہیں ہے بلکہ بندہ اس میں مخیر ہے کیونکہ زبردستی کا دین حقیقت میں دین نہیں۔ یہ تو دلوں کا کام ہے جب وہ اسے ضروری سمجھ کر قلوب کریں پس جسے شہادتین کے اظہار پر مجبور کیا جائے تو یہ حقیقت میں دین نہیں ہے جیسا کہ اگر کسی کو کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ کافر نہیں ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ جو بندوں کا خالق و مالک ہے جب وہ اپنے لیے روا نہیں جانتا کہ بندوں کو اس سلسلے میں پابند کرے تو پھر بندوں کو کس طرح یہ حق دیا جا سکتا ہے۔ اللہ چاہتا تو خود بندوں کو ایک راستے کا پابند بنا لیتا۔ اس کے منصوبۂ تخلیق کی بنیاد ہی انسان کے آزاد ارادے پر استوار ہے۔ اس نے انسان کو فاعل مختار بنا کر اسے اجازت دی ہے کہ وہ جس راستے کو چاہے اختیار کرے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا[2]

ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا ہے، چاہے وہ شکر گزار ہو اور چاہے انکار کرنے والا۔

انسان کے لیے اس نے داخلی و خارجی ہدایت کا انتظام ضرور کیا ہے اور اسے عقل و خرد عطا کر کے دوسری مخلوقات پر خاص شرف بھی بخشا ہے۔ یہی عقل و خرد، انتظام ہدایت اور فاعل مختار ہونا اسے معرض امتحان میں بھی ڈال دیتا ہے۔ اس کے لیے مقابلے کی فضا مہیا کی گئی ہے، حسن عمل سے بڑھ کر احسن عمل کی رغبت دلائی گئی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے معاشرے میں اپنے مابین اور مسلم و غیر مسلم کے مابین یہی فضا پیدا کریں اور یوں منشائے الٰہی کے نمائندے بن جائیں۔

---

[1]۔ طبرسی، الشیخ ابی علی الفضل بن الحسن: مجمع البیان فی تفسیر القرآن (تہران، انتشارات ناصر خسرو، ۱۳۶۵ھ) ج ۲، ص ۶۳۱

[2]۔ ۷۶/دھر: ۳

انبیائے الٰہی کے مخالفین آزادیٔ فکر کے مخالف تھے

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے الٰہی ہمیشہ عقیدے کی آزادی کے علمبردار رہے اور ان کے مخالفین اس آزادی کا راستہ روکتے رہے۔ انبیاء کی مخالفت کرنے والے دراصل جبر و اکراہ کے نمائندے تھے۔ وہ زبردستی انبیاء اور ان کے ماننے والوں کو اپنی ملت اور اپنے دھرم میں لوٹانے کے لیے دھمکی اور تشدد کے حربے استعمال کرتے تھے۔ انبیاء کے مخالفین عقیدے کی آزادی کے بھی مخالف تھے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں قرآن حکیم سے پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے کیا رویہ اختیار کیا، اس سلسلے میں قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے:

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ[1]

کہنے لگے: اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو تمھیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

حضرت ابراہیمؑ کو بھی ان کے چچا آزر نے سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔ قرآن حکیم بیان فرماتا ہے: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ[2] اگر تم باز نہ آئے تو میں ضرور تمھیں سنگسار کر دوں گا۔

حضرت شعیبؑ کی قوم نے بھی اُن سے کہا:

وَلَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ[3]

اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم ضرور تجھے سنگسار کر دیتے کیونکہ تیری ہمارے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

انھوں نے سنگسار تو نہ کیا لیکن جلاوطن کرنے کا اعلان کر دیا۔ سورہ اعراف میں ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ[4]

ان کی قوم کے وڈیرے جو تکبر میں مبتلا تھے کہنے لگے: اے شعیب! ہم تجھے اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا پھر تم ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ۔

---

[1] ۔ ۲۶/الشعراء:۱۱۶

[2] ۔ ۱۹/مریم:۴۶

[3] ۔ ۱۱/ہود:۹۱

[4] ۔ ۷/اعراف:۸۸

شعیب کہنے لگے: کیا چاہے ہم اسے ناپسند کرتے ہوں؟

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء ہمیشہ عقیدے اور رائے کی آزادی کے علم بردار رہے ہیں اور اُن کے مخالفین جبر واکراہ کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ ظلم و تشدد ہمیشہ انبیاء کے مخالفین کا طرز عمل رہا ہے۔

غیر مسلم ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک

اسلام کی تعلیمات میں ہمسائے کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ ہمسایہ مسلمان ہو یا غیر مسلم دونوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے بلکہ اس سلسلے میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔ قرآن حکیم نے خاص طور پر اس پر تاکید کی ہے۔ نبی پاکؐ سے منقول صحیح احادیث بھی اس امر کی شہادت دیتی ہیں۔ سورہ نساء میں ہمسایوں کا ذکر مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔ آیت ملاحظہ کیجیے:

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا[1]

اس آیہ مجیدہ میں ''الجار الجنب'' سے بعض مفسرین کرام نے غیر مسلم ہمسایہ مراد لیا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

فالوصاۃ بالجار مامور بھا مندوب الیھا مسلماً کان اوکافراً۔[2]

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم، یہ مندوب اور پسندیدہ ہے، پڑوسی مسلم ہو یا کافر۔

کچھ صفحات کے بعد لکھتے ہیں: قال العلماء الاحادیث فی اکرام الجار، جائت مطلقة غیر مقیدة حتی الکافر۔[3]

علماء نے کہا ہے کہ پڑوسی کے اکرام واحترام میں جو احادیث آئی ہیں وہ مطلق ہیں، اس میں کوئی قید نہیں ہے، کافر کی بھی قید نہیں۔ استاد ناصر مکارم شیرازی تفسیر نمونہ میں اسی آیت کے ذیل میں

---

[1]۔ ۴/نساء: ۳۶

[2]۔ قرطبیؒ، شمس الدین: الجامع لأحکام القرآن، ت: أحمد البردونی وابراہیم أطفیش (قاہرہ، دارالکتب المصریۃ، ط۲، ۱۳۸۴ھ) ج۵، ص۱۸۴

[3]۔ قرطبیؒ، شمس الدین: الجامع لأحکام القرآن، ت: أحمد البردونی وابراہیم أطفیش (قاہرہ، دارالکتب المصریۃ، ط۲، ۱۳۸۴ھ) ج۵، ص۱۸۸

کہتے ہیں:

یہ بھی ممکن ہے کہ دور کے ہمسایوں سے مراد غیر مسلم ہوں کیوں کہ ہمسائیگی اسلام میں مسلمان پڑوسیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس مفہوم میں غیر مسلم بھی شامل ہیں مگر وہ جو مسلمانوں سے بر سر پیکار نہ ہوں، وہی اس میں آتے ہیں۔

اسلام میں حق ہمسائیگی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیؑ کی مشہور وصیتوں میں ہے:

مازال(رسول اللہ) یوصی بھم حتی ظننا انه سیورثھم: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں اس قدر سفارش فرمائی کہ ہمیں یہ گمان ہونے لگا کہ شاید آپؐ یہ حکم فرمائیں کہ ہمسائے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔[1]

اس سلسلے میں کئی ایک دیگر احادیث رسول بھی ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذی جارہ[2]

جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے ہمسائے کو اذیت نہیں دینا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ نے ہمسایوں کے بارے میں ایسے احکام سے یہی سمجھا کہ وہ مسلمان ہوں یا کافر ان کے ساتھ حسن سلوک کا روا رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمر کے بارے میں ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ بکری ذبح کی اور اپنے غلام سے کہا کہ وہ ہمسائے کو بھی گوشت دے کر آئے۔ غلام نے کہا: جناب! وہ تو یہودی ہے تو آپ نے کہا: یہودی ہے تو کیا ہوا۔ یہ کہہ کر آپ نے رسول اللہ ﷺ کے اسی فرمان کا حوالہ دیا جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ جبریل نے مجھے اس قدر ہمسایوں کے بارے میں حسن سلوک کی مسلسل وصیت کی کہ مجھے لگا کہ وہ ہمسایوں کو وراثت میں حصہ دار بنا دیں گے۔

(مازال جبریل یوصینی بالجار ،حتیٰ قلت لیورثنه)۔[3]

---

[1]۔ شیرازی، ناصر مکارم: تفسیر نمونہ، مترجم: سید صفدر نجفی (لاہور، مصباح القرآن ٹرسٹ، ۲۰۱۱ء) ج ۲، ص ۴۴۶

[2]۔ مسلم بن حجاج: صحیح مسلم، ت: محمد فواد عبدالباقی (بیروت، دار احیاء التراث العربی) ج ۱، ص ۶۸، ح ۴۷

[3]۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، ت: شعیب الارنووط (بیروت، دار الرسالة العالمیة، ط ۲۰۰۹،۱ء) ج ۷، ص ۴۶۲، ح ۵۱۵۲

علامہ رشید رضا مصری اسی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ہٰذا دلیل علیٰ ان ابن عمر فھم من الوصایا المطلقہ فی الجار انھا تشمل المسلم و غیر المسلم و ناہیک بفھمہ و علمہ۔[1]

یہ حدیث اس امر پر دلیل ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر نے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں جو مطلق وصیتیں اور تاکیدیں آئی ہیں ان سے یہی سمجھا کہ ان میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں اور عبداللہ ابن عمر کا فہم اور علم تمھارے لیے کافی ہونا چاہیے۔

دشمنوں کے ساتھ بھی عدالت

قرآن حکیم میں اس سلسلے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ[2]

اے ایمان والو! اللہ کے لیے عدل کے ساتھ گواہی دینے والے بن کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس امر پر نہ ابھارے کہ تم عدل سے کام نہ لو۔ عدل سے کام لو کہ یہی تقویٰ کے نزدیک ترین ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو یقیناً اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

اس آیت میں موجود عدالت کا حکم کس قدر ہمہ گیر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بھی روا نہیں کہ دشمنوں کے ساتھ عدل و انصاف سے کام نہ لیا جائے۔ یہی حکم سورہ مائدہ کی آیت ۲ میں بھی آچکا ہے۔ اسی پس منظر میں مولانا امین احسن اصلاحی نے بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے:

ولا یجرمنکم شنان قوم، یہ ٹکڑا اسی سورہ کی آیت ۲ میں گزر چکا ہے۔ یہ حق و عدل کی راہ کے سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی اور اس کا غلط سے غلط رویہ بھی ہمیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شیطان نے راہ حق سے گمراہ کرنے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے۔ یہود نے محض بنی اسمٰعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اس تمام عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا جس کے وہ گواہ اور ذمہ دار بنائے گئے

---

[1]۔ رشید، محمد رضا: تفسیر المنار (مصر، الھیءۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۹۰ء) ج۵، ص۵۷

[2]۔ ۵/مائدہ: ۸

تھے۔اس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اس فتنے سے بچ کے رہیں۔دوستوں اور دشمنوں دونوں کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی باٹ اور ایک ہی ترازو ہو۔

اعدلوا هو اقرب للتقوى، یہی عدل، تقویٰ سے اقرب ہے، یعنی تقویٰ جو تمام دین و شریعت کی روح اور اہل ایمان کے ہر قول و فعل کے لیے کسوٹی ہے اس سے موافقت رکھنے الا طرز عمل یہی ہے کہ دشمن کی دشمنی کے باوجود اس کے ساتھ کوئی معاملہ عدل و حق سے ہٹ کر نہ کیا جائے۔اس سے دین میں تقویٰ کا مقام واضح ہوا کہ تمام نیکیاں در حقیقت اس کی جڑ سے ہیں۔[1]

مولانا شیخ محسن علی نجفی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اور یہاں سیاق کلام یہ ہے کہ کسی گروہ کی دشمنی حائل بن سکتی ہے کہ انسان مشتعل ہو کر ان کے ساتھ عدل و انصاف نہ کرے۔اس لیے یہاں فرمایا کہ اللہ ہی کے لیے بھرپور قیام کرنے والے بن جاؤ یعنی تعمیل احکام میں تمھارا کردار اللہ کی خوشنودی پر مبنی ہونا چاہیے۔کسی گروہ کی دشمنی اس راہ میں رکاوٹ نہ بنے اور گواہی دیتے ہوئے عدل و انصاف کو سامنے رکھو۔

انصاف، انسانی بنیادی حقوق میں شامل ہے۔اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسلام عدل و انصاف کو انسانی بنیادی حقوق میں سے قرار دیتا ہے۔اس میں مذہب، نژاد و دیگر امور کو کوئی دخل نہیں ہے۔اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم ملا کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کے ساتھ پیش آؤ کیونکہ جہاں وہ دشمن ہے وہاں وہ انسان ہے اور وہ انسان پہلے ہے اور دشمن بعد میں۔چنانچہ حضرت علی علیہ السلام ظلم و ناانصافی سے منع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فانهم صنفان: اما اخ لک في الدين واما نظير لک في الخلق۔

لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔یا تو تمھارا برادر دینی ہے یا تجھ جیسی مخلوق۔

جب بیت المال کی تقسیم میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک اختیار فرمایا تو لوگوں کے اعتراض پر آپ نے فرمایا:

لو كان المال لي لسويت بينهم فكيف وانما المال مال الله۔

اگر یہ مال میرا ذاتی ہوتا تو بھی میں ان میں مساویانہ تقسیم کر دیتا۔اب میں کس طرح

---

[1]۔ اصلاحی، امین احسن مولانا: تدبر قرآن، (فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۲۰۰۷ء) ج ۲، ص ۴۷۱

مساویانہ تقسیم نہ کروں جب کہ مال اللہ کا ہے۔[1]

کفار سے وعدے پورے کرنا

قرآن حکیم کی یہ آیت اس سلسلے میں بہت اہمیت رکھتی ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْـًٔا وَّلَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ[2]

ہاں البتہ مشرکوں میں سے جنھوں نے تم سے معاہدہ کیا اور پھر اس کی کچھ بھی خلاف ورزی نہ کی اور نہ تمھارے اوپر انھوں نے چڑھائی کی تو ان کے ساتھ کیے گئے عہد کو اس کی مدت تک پورا کرو یقیناً اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں موجود جملہ: ''اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے علامہ طباطبائی کہتے ہیں:

وقوله: (ان الله يحب المتقين) فى مقام التعليل لوجوب الوفاء بالعهد ما لم تنقضه المعاهد المشرک، وذلک يجعل احترام العهد وحفظ الميثاق أحد مصاديق التقوى المطلق الذى لا يزال يأمر به القرآن وقد صرح به فى نظائر هذا المورد كقوله تعالىٰ: (ولا يجرمنكم شنآن قوم على أن لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوى) وقوله: (ولا يجرمنكم شنآن قوم أن صدوكم عن المسجد الحرام ان تعدوا، و تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان واتقوا الله)[3]

یہ جملہ ایفائے عہد کے واجب ہونے کی علت بیان کر رہا ہے اور یہ کہ ایفائے عہد اور عہد کو محترم جاننا جب کہ دشمن نے اسے توڑا ہو تقویٰ کے مطلق مصادیق میں سے ایک ہے، وہی تقویٰ کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مسلسل حکم دیا ہے۔ یہ بات زیر بحث آیت میں اگرچہ صراحت سے

---

[1]۔ نجفی، محسن علی: الکوثر فی تفسیر القرآن (اسلام آباد جامعۃ الکوثر، اگست ۲۰۰۵ء) ج ۲، ص ۴۵۴ (ضمنی حوالہ جات: نہج البلاغہ، خ ۵۳، مالک اشترؒ کے نام عہد نامہ اور نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶)

[2]۔ ۹/توبہ: ۴

[3]۔ طباطبائی، محمد حسین، علامہ: المیزان فی تفسیر القرآن (بیروت، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ۱۴۲۲ھ) ج ۹، ص ۱۵۴ و ۱۵۵

بیان نہیں ہوئی تاہم اس سے ملتے جلتے دیگر موارد میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ مثلاً آیت:

وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی

اسی طرح یہ آیت ہے:

وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْاوَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ

اسی ضمن میں مولانا سید علی نقی نقوی لکھتے ہیں:

آخری فقرہ سے کہ ''اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے''۔۔۔ یہ معنی نکلتے ہیں کہ کفار کے ساتھ بدعہدی کرنا تقویٰ کے خلاف چیز ہے اور اس میں مواخذۂ اخروی ہے جس سے بچنا تمھیں ضروری ہے۔[1]

مومنین کی عمومی صفات بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم کہتا ہے:

وَالَّذِیْنَ ہُمْ لِاَمٰنٰتِہِمْ وَعَہْدِہِمْ رٰعُوْنَ[2]

اور وہ لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس میں مسلمان اور غیر مسلمان دونوں کی امانتوں کی ادائیگی اور دونوں سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ غیر مسلموں سے وعدوں کی پاسداری کے حکم میں ذمی بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے عصر حاضر میں آئینی ریاستوں میں شہریوں کو جو عمومی حقوق دیے گئے ہیں وہ بھی ریاست کا اپنے شہریوں کے ساتھ عہد ہی ہوتا ہے جس میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔

غیر مسلموں پر انفاق

قرآن حکیم میں بالعموم مساکین، فقراء، یتامیٰ اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ بھوکوں، پیاسوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دی گئی ہے بلکہ اسے ایمان باللہ اور دین کا بنیادی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم کئی ایک آیات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

[1]۔ نقوی، سید علی نقی، علامہ: تفسیر فصل الخطاب (لاہور، مصباح القرآن ٹرسٹ، ۲۰۱۱ء) ج ۲، ص ۲۱۷

[2]۔ ۲۳/المومنون: ۸

مثلاً سورہ دھر میں ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا [1]

اور جو اللہ کی رضا کے لیے مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔

آیت میں تخصیص نہیں کی گئی کہ مسکین، یتیم اور اسیر مسلمان ہے یا غیر مسلم بلکہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسیر جس کا اس آیت میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ غیر مسلم تھا۔

زوۂ بدر میں 70 قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ سارے کے سارے مشرک تھے یا بظاہر سب مشرک تھے۔ ان کے ساتھ رسول اسلامؐ اور آپ کے صحابہؓ نے جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

غیر مسلموں کے عبادت خانوں کا احترام

قرآن حکیم نے ان سارے مقدس مقامات کا ذکر احترام سے کیا ہے جہاں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا [2]

اور اگر اللہ بعض انسانوں کو بعض کے ذریعے سے ہٹانہ دیتا تو خانقاہیں، گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے سب منہدم کر ڈالی جاتیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ مختلف مذاہب و ادیان کی عبادت گاہوں کو گرایا جائے یا انھیں تباہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے معاشروں میں موجود ایسی تمام عمارتوں اور عبادت خانوں کی حفاظت اپنے ذمے لیں جن میں مختلف ادیان کے ماننے والے اپنے اپنے طریقے سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اسے یاد کرتے ہیں۔

اس آیت سے یہ نکتہ بھی اخذ کی جاسکتا ہے کہ جب اللہ کو مختلف مذاہب کی عبادت خانوں کی حفاظت منظور ہے تو پھر ان عبادت خانوں میں اللہ کو یاد کرنے والوں کی حفاظت اور ان سے حسن

---

[1] - ٧٦/دھر: ٨

[2] - ٢٢/الحج: ٤٠

سلوک بدرجہ اتم منظور ہے۔اسی طرح ان عبادت خانوں کا انتظام کرنے والوں یعنی پروہتوں، پادریوں اور عبادت گزاروں کا احترام اور انھیں ضروری وسائل کی فراہمی اسلامی معاشرے کے ذمہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی معاشرتی روایت جس کا سلسلہ آنحضرتؐ کی زندگی سے شروع ہوتا ہے اور صدر اسلام کے مسلم حکمرانوں نے بالعموم جس کی پاسداری کی ہے اسلامی تعلیمات ہی کی غماز ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج پاکستان اور بعض دیگر مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کے عبادت خانے محفوظ نہیں رہے۔ یہ ایک بہت المناک صورت حال ہے جو قرآن اور سنت کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے۔

حسن کلام

ویسے تو سارے انسانوں کو آپس میں اچھے انداز سے گفتگو کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بری باتوں سے اعراض کا عمومی حکم قرآن حکیم میں دیا گیا ہے جس میں مسلم و غیر مسلم سب شامل ہیں تاہم ایمان والوں کی ذمہ داری اس لیے سوا ہے کہ وہ قرآن حکیم کو اللہ کی سچی کتاب سمجھتے ہیں۔ قرآن حکیم میں مسلمانوں کو گفتگو کا سلیقہ یوں سکھایا گیا ہے:

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا[1]

انسانوں سے حسین پیرائے میں بات کرو۔

آیہ مجیدہ میں لفظ ''ناس'' حکم کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے اور واضح طور پر بتاتا ہے کہ حسن کلام اور حسن تکلم مسلمان اور غیر مسلم سب کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہیے۔ مجادلے کی ضرورت تو دیگر ادیان سے ہی عموماً پیش آتی ہے اس کے لیے بھی مجادلہ احسن کی اصطلاح قرآن حکیم نے استعمال کی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا
بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ[2]

---

[1]. ۲/بقرہ:۸۳

[2]. ۲۹/عنکبوت:۴۶

اہل کتاب سے سوائے احسن طریقے کے کسی اور طریقے سے مجادلہ نہ کرو مگر ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا اور تم کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے اور ہمارا اور تمھارا الہ ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ان غیر مسلموں سے جوڑنے کی اور ایک طرح سے قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو پہلی نازل شدہ کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ انھیں قریب کرنے کے لیے یہ کہیں کہ ہم اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ جو تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ پھر یہ کہہ کر کہ تمھارا اور ہمارا الہ ایک ہی ہے اور ہم اسی کو تسلیم کرنے والے ہیں محبت و قربت کا ایک اور پیغام بھی دیا گیا ہے۔

''التی ھی احسن'' کی تفسیر کرتے ہوئے استاد ناصر مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

تعبیر به"التی هی احسن"، تعبیر بسیار جامعی است که تمام روشهای صحیح و مناسب مباحثه را شامل می شود، چه در الفاظ، چه درمحتو ای سخن، چه درآهنگ گفتار، وچه در حرکات دیگر همراه آن-بنابر این مفهوم این جمله آن است که الفاظ شمامودبانه، لحن سخن دوستانه، محتوای آن مستدل، آهنگ صدا خالی از فریاد و جنجال وهر گونه خشونت وهتک احترام، همچنین حرکات دست و چشم و ابروکه معمولا مکمل بیان انسان هستند همه باید درهمین شیوه و روش انجام گیرد-وچه زیبا است تعبیرات قرآن که دریک جمله کوتاه یک دنیا معنی نهفته است-اینهاهمه به خاطر آن است که هدف از بحث و مجادله برتری جوئی و تفوق طلبی و شرمنده ساختن طرف مقابل نیست، بلکه هدف تأثیر کلام و نفوذ سخن در

اعماق روح طرف است، و بهترین راه برای رسیدن به این
هدف همین شیوه قرآنی است-[1]

یعنی: التی ھی احسن کی تعبیر بہت جامع ہے کہ جس میں مباحثے کے تمام صحیح و مناسب اسلوب اور پہلو شامل ہو جاتے ہیں۔ اس میں الفاظ بھی شامل ہیں، مفہوم بھی، لہجہ بھی اور دیگر حرکات بھی۔ اس لیے اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ تمھارے الفاظ مؤدبانہ ہوں، لحن دوستانہ ہو، مطلب مستدل ہو، لہجے میں شور شرابہ نہ ہو۔ اس میں کوئی سختی اور بے احترامی بھی نہ ہو۔ اسی طرح ہاتھ، آنکھ اور ابرو کی حرکات بھی اسی اسلوب اور روش کے مطابق ہوں کیونکہ یہ حرکات بھی تکمیل بیان میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

قرآن کی تعبیرات کس قدر خوبصورت ہیں کہ ایک چھوٹے سے جملے میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ سب اس لیے ہے کہ بحث و مجادلہ کا مقصد بالاتری کا حصول، تفوق قائم کرنا اور مقابل کو شرمسار کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کلام پر تاثیر ہو اور بات سامنے والے کو روح کی گہرائیوں میں اتر جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے بہترین طریقہ یہی شیوۂ قرآنی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر قرآن حکیم نے انھیں سب و شتم کرنے سے منع کیا ہے جنھیں بعض لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں۔

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ[2]

یہ لوگ جنھیں اللہ کے سوا پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

باہمی تعاون و معاشرت

قرآن حکیم نے عمومی طور پر حکم دیا ہے کہ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کریں جب کہ گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ[1]

[1]. شیرازی، ناصر مکارم، تفسیر نمونہ (قم، ایران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۶۷ھ) ج۱۴، ص۲۹۹

[2]. ۶/انعام: ۱۰۸

اس آیہ مجیدہ کے سیاق وسباق کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصولی طور پر یہ غیر مسلموں سے تعاون کا بنیادی اصول بیان کر رہی ہے اگرچہ مسلمانوں کو بھی آپس میں تعاون کے لیے اسی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر اس اصول کو قومی اور عالمی روابط میں اختیار کر لیا جائے تو پوری دنیا امن کا گہوارہ بن جائے اور ظلم و ستم، استحصال اور استعمار کا خاتمہ ہو جائے۔ بہر حال مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے معاشرے میں غیر مسلموں کے ساتھ روابط کو اسی اصول پر استوار کریں۔ نیکی اور تقویٰ کا معاشرتی مفہوم خاصا واضح ہے جیسا کہ ہر معاشرے میں معروف و منکر کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں اہل کتاب کے ساتھ معاشرت اور خاص طور پر کھانے پینے اور شادی بیاہ کے بنیادی اصول اس آیہ مجیدہ میں بیان کیے گئے ہیں:

اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ وَ طَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ وَ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ وَ لَا مُتَّخِذِیۡۤ اَخۡدَانٍ[2]

آج تم پر پاک چیزوں کو حلال کر دیا گیا ہے اور جن لوگوں کو کتاب عطا کی گئی ہے ان کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومنات میں سے پاک دامن عورتیں اور جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے ان کی پاکدامن عورتیں (تمھارے لیے حلال ہیں) جب کہ تم ان کے مہر ادا کر چکے ہو البتہ آزاد شہوت رانی اور چوری چھپے کے تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان احکام کی تفصیلات دیگر آیات اور احادیث کی روشنی میں علماء نے فقہی احکام کی کتب میں بیان کی ہیں۔

مشرک والدین سے حسن سلوک

اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن حکیم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اُن کے سامنے اُف تک نہ کرو، ان کے سامنے انکساری کے ساتھ اپنے کندھے جھکا دو۔ قرآن تو

---

[1]. ۵/مائدہ:۲

[2]. ۵/مائدہ:۵

مشرک والدین سے بھی حسن سلوک کا حکم دیتا ہے۔اس سلسلے میں سورہ لقمان کی یہ آیت واضح طور پر راہنمائی کرتی ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰکَ عَلآی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَالَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا[1]

اور اگر وہ تجھے اس بات پر ابھاریں کہ تو اُسے میرے ساتھ شریک قرار دے کہ جس کا تجھے علم نہیں تو اس میں ان دونوں کی فرمانبرداری نہ کرنا اور ان دونوں کے ساتھ اس دنیا میں اچھا سلوک روا رکھنا۔

واضح ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا حکم مشرک ہی دے سکتا ہے۔ لہٰذا آیہ مجیدہ کے مطابق اگر ماں باپ اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا کہیں تو اس میں ان کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔اس کے باوجود ان کے ساتھ اچھا سلوک زندگی بھر روا رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔قرآن اور اسلام کی عظمت اور معاشرتی رواداری کے حوالے سے اس دین برحق کی تعلیمات کی وسعت پر یہ آیہ مجیدہ بہت بڑی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

سلوب دعوت

اسلام عالمگیر دین ہے،اس کی دعوت پوری انسانیت کے لیے ہمیشہ جاری رہی ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اپنے اکثریتی معاشرے میں بھی اس دعوت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اگرچہ وہ زبردستی نہیں کر سکتے۔ جبر واکراہ سے کام نہیں لے سکتے جیسا کہ قبل ازیں واضح کیا جا چکا ہے۔تاہم اس دعوت کا اسلوب کیا ہو،اس کے لیے قرآن حکیم نے متعدد مواقع پر دعوت و تبلیغ کی حکمت اور اصول بیان کیے ہیں مثلاً فرمایا گیا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ[2] اے نبیؐ! نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔اس آیہ مجیدہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

داعی حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں،ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم

[1]. ۳۱/لقمان:۱۵

[2]. ۷/اعراف:۱۹۹

خُو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے، نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے، مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذارسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، دُرُشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعال طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں ہے۔اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ ''غضب اور رضا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے میں اس سے جُڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں، جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں۔'' اور اسی چیز کی ہدایت آپؐ ان لوگوں کو کرتے تھے جنھیں آپؐ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بشروا ولا تنفروا ویسروا ولا تعسروا، یعنی ''جہاں تم جاؤ وہاں تمھاری آمد لوگوں کے لیے مژدۂ جاں فزا ہو نہ کہ باعث نفرت اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے۔'' اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی ''یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو، ورنہ اگر تم دُرُشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔''[۱]

غیر مسلموں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کے عمومی احکام کی وضاحت ایک حد تک آچکی ہے البتہ ہم اپنی معروضات ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرکے ختم کرتے ہیں تاکہ مسئلے کا دوسرا نہایت اہم پہلو نظرانداز نہ ہو جائے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم میں ایسی متعدد آیات ہیں جن میں غیر مسلموں کو اپنا سرپرست نہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بیشتر مسلمان حکومتوں نے اس سلسلے میں قرآن حکیم کے احکام کی پیروی نہیں کی۔ ہم چونکہ اس وقت اس موضوع پر بات نہیں

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، (ترجمان القرآن لاہور، مارچ ۲۰۱۱ء) ج ۲، ص ۱۱۱

کررہے اس لیے اس کی تفصیل میں نہیں جاسکتے۔ البتہ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ایسی آیات سے یہ معنی بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر موجود غیر مسلموں کو ایسے مناصب پر فائز نہ کیا جائے جس سے ریاست کا اصل اقتدار ان کے ہاتھ میں چلا جائے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ عصر حاضر کی آئینی حکومتوں میں اقتدار عموماً کسی ایک فرد کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ ریاست کے مختلف ستونوں کے مابین منقسم ہوتا ہے۔ بہر حال اس قدر کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مسلمانوں کو اغیار کی سرپرستی قبول نہیں کرنا چاہیے۔ حسن تعامل اور سرپرستی قبول کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر مسلم طاقتوں اور ریاستوں نے جو جمہوریت، انسانی حقوق اور ہر طرح کی آزادی کی علمبردار بھی ہیں مختلف حیلوں سے مسلمان معاشروں اور شہریوں پر اپنا استعماری اقتدار قائم کررکھا ہے۔ یہ موضوع اپنے مقام پر بہت اہم ہے۔ البتہ زیر بحث مقالے میں اس پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے اس سلسلے میں ہم فقط صرف ایک آیہ مجیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔

لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَلَیۡسَ مِنَ اللّٰہِ فِیۡ شَیۡءٍ اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡہُمۡ تُقٰىۃً وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ وَ اِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ[1]

مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا سرپرست نہیں بناتے اور جو ایسا کرے تو اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے، اللہ تمھیں اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

1. ۳/آل عمران: ۲۸